مولانا محمد حنیف ندوی

اعجازِ قرآن اور اس کی حقیقت

(۲)

اعجازِ قرآن کے بارہ میں ناقدانِ ادب وشعر کا یہ اختلاف دراصل اندازِ فکر کا اختلاف ہے سوال یہ ہے کہ وہ شی جسے ہم معجزہ قرار دیتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے؟ کچھ لوگوں نے اسے قرآن کے الفاظ اور جملوں میں حسنِ تالیف کی صورت میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ کچھ نے غیب کی خبروں میں اس کو ڈھونڈھنے کی سعی کی۔

اور کچھ اہلِ نظر کو یہ بات بھائی کہ قرآن نے گزشتہ اقوام وملل کے کوائف وحالات کی کتنی صحیح تصویر پیش کی ہے اور کوئی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس نے نہ صرف زندگی کے مسائل کو بہترین اسلوب میں سمجھایا ہے، بلکہ ان کی نفسیاتی کمزوریوں کو بھی واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کسی کی نظر اس کی اس خوبی پر پڑی کہ اس میں معانی اور اسلوبِ تعبیر کے سلسلہ میں غضب کا تطابق پایا جاتا ہے کسی کو قرآن کی اس ادائے خاص نے فریفتہ کیا کہ یہ اگرچہ ٹھیٹھ نثر ہے۔ تاہم اس میں شعر کی تمام خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کچھ ان میں ایسے حضرات بھی نکلے جنھوں نے نفسِ مسئلہ کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں جو ہمہ جہتی حسن اور نکھار ہے سرے سے اس کا تجزیہ ہی ناممکن ہے۔

قرآن کے اعجاز کا اہم پہلو اس کی لسانی خوبیاں ہیں۔ حرف وادات کے استعمال کے بارہ میں قرآن کا اندازِ خاص۔ حرف 'اِن' کا استعمال

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تمام پہلو اپنی جگہ اہم اور مسلّم۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں ان سب پہلوؤں کا استیعاب کیا گیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے مخاطبین اولین کے لیے زیادہ شائستہ التفات اور قابلِ فہم پہلو قرآن حکیم کی لسانی خصوصیات اور معجزہ طرازیاں ہی ہوسکتی ہیں اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فکر وبحث میں ہم زیادہ تر اسی پہلو پر اظہارِ خیال کریں۔

خود یہ پہلو دو طرح کے امکانات کا حامل ہے یا تو اس کے متعلق ایک تفصیلی اور فنی جائزہ پیش کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قرآن حکیم حذف، تقدیر، تقدیم، تاخیر، تشبیہ استعارہ، کنایہ، یا رمز و اشارہ اور بلاغت کے اعتبار سے حسن و کمال کے کن کن نوادر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور یا پھر قارئین کی سہولت کی خاطر اس کی چند جھلکیاں دکھا دینے ہی پر اکتفا کرلیا جائے۔ ہم نے بوجوہ یہ دوسری راہ اختیار کی ہے۔

قرآن حکیم حروف و ادات کے استعمال میں عربی ادب کی باریکیوں کا کس درجہ حامل ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

حرف "اِن" کے استعمال کے بارہ میں علم النحو کے ماہرین اور فصحا کے حلقوں میں یہ مسلّم ہے کہ یہ اس وقت آئے گا۔ جب متعلقہ فعل کا وقوع و تحقق یقینی اور ضروری نہ ہو۔ یعنی تم یہ تو کہہ سکو گے ان تاتنی اکرمك (تو اگر آئے گا تو میں تیری عزت کروں گا)۔ کیونکہ اس کا آنا اور نہ آنا دونوں ممکن ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ آئے، اور ہو سکتا ہے نہ آئے لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ ان طلعت الشمس اتیتك (اگر سورج طلوع ہوا تو میں آؤں گا) کیونکہ سورج کا طلوع یقینی امر ہے۔ یہاں محل اذا کا ہے کیونکہ اذا کا استعمال ایسے فعل پر ہوتا ہے جس کا وقوع و تحقق زیادہ یقینی اور اغلب ہو۔ اس کے لیے کہیں گے: اذا طلعت الشمس اتیتك (جب سورج طلوع تو میں آؤں گا) دونوں حروف کے اس باریک فرق کو ذہن میں رکھیے اور اس آیت میں بیک وقت ان دونوں حروف کے موزوں استعمال کی داد دیجیے۔ سورہ شوریٰ میں ہے:

وانا اذا اذقنا الانسان منا رحمۃً فرح بھا، وان تصبھم سیئۃ بما قدمت ایدیھم فان الانسان کفور [۱۵]

اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اگر ان کو انہی کے اعمال کے سبب تنگی ترشی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو سب احسانوں کو بھول جاتے

ہیں بلاشبہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی ارزانیوں سے چونکہ اکثر و بیشتر انسان بہرہ مند ہوتا رہتا ہے اس لیے اس کے لیے حرف اذا کا استعمال برمحل ہے اور آزمائش و ابتلاء سے اس کا دوچار ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ لغزشوں کو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر دیتا ہے۔ اس بنا پر یہاں حرف اِن کا لانا ہی مناسب تھا۔

اعراب کی تبدیلی میں حکمت کا پہلو

سورۂ ہود کی ایک ہی آیت میں لفظ سلام مرفوع بھی ہے اور منصوب بھی

ولقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ قالوا سلاماً ط قال سلامٌ [۲]

اس میں حسن ادب اور مرتبہ و درجہ کی نزاکت کو کس درجہ ملحوظ و مرعی رکھا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس تفصیل سے لگائیے۔ کہ فرشتے جو سلام کہتے ہیں اس میں فعل محذوف ہے۔ اس لیے یہ جملہ فعلیہ ہوا۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم ؑ نے جو سلام کو بصورت مرفوع ذکر کیا، تو یہ جملہ اسمیہ ہوا۔

عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ فعل تجدد و حدوث پر دلالت کرتا ہے اور اسم ثبوت و دوام پر۔ فرشتے چونکہ حضرت ابراہیم کو اولاد کے بارہ میں ایک خاص خوشخبری سنانے آئے تھے۔ اس لیے انھیں قاعدہ کی رُو سے جملہ فعلیہ پر ہی اکتفا کرنا چاہیے تھا۔

حضرت ابراہیم بفحوائے

واذا حییتم بتحیۃٍ فحیوا باحسن منھا۔ [۳]

اور جب تمھیں کوئی دعا دے تو تم اس سے بہتر انداز میں دعا دو۔

اس بات کے مکلف تھے کہ سلام کا جواب زیادہ بہتر طریق سے دیں۔ اس بنا پر انھوں نے جملہ اسمیہ استعمال کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم دائمی اور سلامتی کے سزاوار ہو۔ ایک ہی آیت میں اعراب کے ذرا سے اختلاف سے معنی میں یہ تنوع قرآن کے جمال و کمال کی ایک جھلک ہے۔

---

[۲] ۶۹ [۳] النساء: ۸۶

تقدم وتأخر اور اعجاز

کبھی کبھی وہ جملہ جس کو نحو کے لحاظ سے موخر ہونا چاہیے، مقدم کر دیا جاتا ہے تو اس میں نئی معنویت ابھر آتی ہے۔ قرآن سے اس کی بھڑکتی ہوئی مثال یہ پیش کی جاسکتی ہے:

وجعلوا للہ شرکاء الجن[۴]

اور لوگوں نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرایا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر لفظ جن کو شرکا سے پہلے رکھا جاتا تو عربیت کے لحاظ سے بالکل درست تھا۔ لیکن اس کے معنی صرف یہ ہوتے کہ مشرکین مکہ نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے۔ یہ ایک طرح کی خبر اور اطلاع ہوتی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ شرک کی یہ نوعیت حد درجہ مذموم ہے۔ یعنی انھوں نے شریک بھی ٹھہرایا تو کس کو؟ جنّوں کو۔

اسمائے نکرہ اور معرفہ کا حسنِ استعمال

عربی میں نکرہ اور معرفہ دونوں کا استعمال ہوتا ہے۔ صرف اداشناسانِ زبان ہی جان سکتے ہیں کہ نکرہ کا محل کیا ہے اور معرفہ کہاں استعمال ہونا چاہیے۔ یا یہ کہ تنکیر سے کیا کیا معنوی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ متعدد مثالوں میں سے بطور نمونہ کے اس ایک مثال پر غور کیجیے۔ مثال یہ ہے:

ولتجدنهم احرص الناس علی حیاۃ[۵]

بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی کے کہیں زیادہ حریص پاؤ گے۔

یہاں اگر لفظ حیاۃ معرفہ ہوتا تو مطلب یہ ہوتا کہ یہودیوں کے ہاں ایثار و قربانی کا جذبہ یکسر مفقود ہے۔ چنانچہ یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ کوئی بھی لمحہ ایسا آئے جب انھیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ لفظ حیاۃ کی تنکیر سے قطع نظر اس کے کہ ترکیب میں ادب کے نقطہ نظر سے آیت کے حسن و جمال میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ لفظی معنی میں جو اضافہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ غرض یہ بتانا نہیں۔

---

[۴] الانعام: ۱۰۰ [۵] البقرہ: ۹۶

کہ یہودیوں کو زندگی سے کس درجہ پیار ہے۔ بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ زندگی کے بارہ میں یہودیوں کی نفسیات کیا ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خطرہ اور آزمائش میں پڑے بغیر زندگی بسر کی جائے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ یعنی مقصد کسی نہ کسی حال میں زندہ رہنا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہنا ہے۔

قاضی عبدالجبار المعتزلی کی یہ رائے صحیح نہیں کہ الفاظ میں بجائے خود حسن و قبح کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا۔ قرآن نے الفاظ کے انتخاب میں بھی معجزانہ سلیقہ سے کام لیا ہے۔

ہم قاضی ابوالحسن عبدالجبار المعتزلہ (المتوفی ۴۱۵ھ) کی اس رائے سے اظہار اتفاق نہیں کر سکتے کہ قرآن حکیم نے جو ذخیرہ الفاظ استعمال کیا ہے اس میں بجائے خود کوئی حسن یا خوبی پائی نہیں جاتی۔ کیونکہ ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ فرداً فرداً مختلف معانی پر دلالت کناں ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے الفاظ میں اعجاز کی خوبیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب یہ ایک آیت یا جملہ کا جزوِ ترکیبی بنتے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن حکیم نے اظہارِ مطلب کے لیے جن الفاظ کو چنا ہے۔ دو خوبیاں ان میں نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ذخیرہ الفاظ ایسا ہے جس میں دلالت و تعبیر کے علاوہ زندگی، بقا اور مقابلہ کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے اس ارتقا کے باوجود جو جدید عربی میں الفاظ، ترکیب اور نحو کے میدانوں میں رونما ہوا ہے۔ قرآن حکیم کا کوئی لفظ متروک یا فرسودہ قرار نہیں پایا۔ آج بھی یہ ذخیرہ ایسا شگفتہ اور تر و تازہ ہے کہ جس کے استعمال سے کسی بھی عبارت میں جان پڑ جاتی ہے۔

قرآن کا ہر لفظ عمدہ آہنگ اور نکھار لیے ہوئے ہے

قرآن حکیم میں الفاظ کی ان معجزہ طرازیوں کے علاوہ جن کا تعلق ترکیب و تالیف کے کمالات اور خوبیوں سے ہے خود الفاظ کی اپنی ایک حیثیت اور اہمیت بھی ہے۔ ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کو سننے سے کان ابا کریں۔ کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں عامیانہ پن پایا جائے اور جو معنوی اعتبار سے کھوکھلا اور سطحی ہو۔ کوئی لفظ ایسا نہیں جو قریش کے صاف ستھرے ذوقِ عربیت کے منافی ہو اور زمرہ میں دخیل ہوئی لسانِ مبین کے حسین سانچہ میں ڈھل کر نہ نکلا

ہو بلکہ اس کا ہر لفظ خوش گوار، خوش آہنگ اور اس طرح کا صوتی نکھار لیے ہوتے ہے کہ نہ صرف کان اس سے آشنا معلوم ہوتے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قلب و ذہن بھی اس سے غیر شعوری طور پر پہلے آگاہ ہیں۔ ان میں بلا کی ملائمت، مٹھاس اور کھنک پائی جاتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، ان کا انتخاب اس خدائے پاک نے کیا ہے جس کا علم حسن و جمال کی ایک ایک ادا کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔

ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کچھ نہیں کہنا چاہتے کیونکہ اس کا تعلق سراسر ذوق و وجدان کی صحت اور سلامتی سے ہے۔ قارئین کرام کو چاہیے کہ وہ خود اس نقطۂ نظر سے قرآن حکیم کی تلاوت کریں۔ اس کی ایک ایک سورت کا جائزہ لیں، اور ایک ایک آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ پر غور کریں۔ انھیں محسوس ہوگا کہ یہ صرف الفاظ نہیں، آہنگ و صوت کا حسین امتزاج بھی ہیں۔

الفاظ اور مفردات کی بحث چھڑی ہے تو یہ بھی دیکھتے جائیے کہ قرآن حکیم نے ان کے استعمال میں اختلاف اعراب۔ تقدیم و تاخیر اور تنکیر و معرفہ کے علاوہ اور کن کن لطائف کی طرف ذہن و فکر کو ملتفت کیا ہے۔

یاد رہے کہ علوم قرآن کے سلسلے میں یہ بحث بجائے خود مستقل بالذات اور وسیع تر موضوع ہے جو خاص توجہ چاہتا ہے۔ لیکن ہماری تنگ دامانی اس سے زیادہ کی متحمل نہیں کہ ہم حد درجہ اس اختصار سے کام لیں۔

قرآن کی خوبی یہ ہے کہ اس نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کا اظہار کیا ہے۔

ہمارے نزدیک ان لطائف میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ عربی زبان میں سے جس کا دامن ہزاروں الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن نے صرف چند سو الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور انہی سے چند سو الفاظ سے کام لے کر انفرادی و اجتماعی مسائل سے لے کر مابعد الطبیعی حقایق تک تمام مسائل کو باحسن وجہ سلجھایا اور نکھارا ہے۔ یعنی کم سے کم ذخیرۂ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معانی کی نشاندہی کی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ہدایت کو لیجیے۔ قرآن حکیم نے اس ایک لفظ کو سیاق و سباق کی مناسبت کے پیشِ نظر تقریباً چار معانی

استعمال کیا ہے:

۱۔ اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ہر شی کی تخلیق کی ہے۔ وہاں اس کے فرائض کا تعین بھی کر دیا ہے:

ربنا الذی اعطی کل شیٔ خلقہ ثم ھدی[۶]

ہمارا وہ پروردگار ہے جس نے ہر چیز کو شکل و صورت بخشی اور پھر اس کے فرائض کی طرف اس کی رہنمائی بھی کی۔

۲۔ دینی رہنمائی کے معنوں میں:

وجعلنٰھم ائمۃ یھدون بامرنا[۷]

اور ہم نے ان کو قوموں کا پیشوا ٹھہرایا، کہ ہمارے حکم سے لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔

۳۔ توفیقِ ہدایت کے معنوں میں:

وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی[۸]۔

اور جو لوگ ہدایت سے بہرہ ور ہیں ان کو مزید ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

ازدیادِ مراتب اور درجاتِ اخروی میں پیشرفت و ارتقا کے معنوں میں۔

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[۹]

اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ضرور ان کو ازدیادِ مراتب کی راہ دکھائیں گے۔

لفظ ہدایت کے معنی و اطلاق کی اس تقسیم پر غور کیجیے۔ کتنی حکمتیں فکر و نظر کی سطح پر ابھرتی ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ راہنمائی اور اطلاق کا اصول ہمہ گیر ہے اور کائنات کا کوئی مظہر بھی اس سے محروم نہیں۔ وہی چیز جسے ہم عالمِ تکوینی میں قوانینِ قدرت کہتے ہیں مذہب و اخلاق کے دائرے میں اسکا نام ہدایت ہے۔ حکمت کا دوسرا پہلو اس میں یہ ہے کہ ہدایت و راہنمائی کا تعلق صرف انسانی ارادہ و اختیار ہی سے نہیں۔ توفیقِ الٰہی سے بھی ہے۔

---

[۶] طٰہٰ: ۵۰
[۷] الانبیاء: ۷۳
[۸] محمد: ۱۷
[۹] العنکبوت: ۶۹

تیسرا نکتہ اس تقسیم میں یہ پنہاں ہے کہ ہدایت و رہنمائی کا عمل یک طرفہ نہیں، دو طرفہ ہے۔ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پالینے کی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نہ صرف توفیق و تیسیر سے اس کو بہرہ مند کرتا ہے بلکہ اس کے لیے نئے نئے درجات و مراتب کی طرف ارتقاء و پرواز کے مواقع بھی مہیا کرتا ہے۔

اسی طرح لفظ وحی کے اطلاقات پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ قرآن حکیم نے وحی رسالت کے علاوہ اس ایک سادہ سے لفظ کو کن معارف علمیہ اور نکات حکمیہ کے اظہار کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

کائنات سے متعلق یہ سوال بہت قدیم بھی ہے اور اسی نسبت سے بہت اہم بھی کہ کیا یہ اپنے وظائف و اعمال کے ادا کرنے میں آزاد اور خود مکتفی ہے اور اس کی حیثیت ایک ایسی خودکار مشین کی سی ہے جو اپنے کل پرزوں کی تخلیق بھی کرتی ہے اور ان کے اعمال و وظائف کا تعین بھی۔ یا اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی ارتقائی چال میں، ہر ہر قدم پر اپنے صانع و خالق کی ہدایات کی پابند ہے۔ قرآن حکیم نے اس دوسری رائے کو اختیار کیا اور ان ہدایات کو جن کے بل پر نظام کائنات اپنے مفوضہ فرائض کو انجام دے رہا ہے۔ وحی کے لفظ سے تعبیر فرمایا:

فقضاھن سبع سمٰوٰتٍ فی یومین واوحی فی کل سماء امرھا [۱۲]

پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے کام اور فرائض کے بارہ میں وحی بھیجی۔

افلاطون نے آسمانوں میں جس حسن و جمال اور نظم و قاعدہ کی جھلکیاں دیکھیں۔ نظام عالم میں ارسطو نے جس حرکت و تغیر کا مشاہدہ کیا تھا اور قرون وسطیٰ کے فلسفیوں نے کائنات اور خدا میں جس ربط و تعلق کو تلاش کرنے کی سعی کی تھی لفظ وحی سے ان سب کی تشریح ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رشد و ہدایت کے لیے پیغمبر کا قلب جس طرح ہر آن تجلیات وحی کا منتظر رہتا ہے۔ اسی طرح کائنات بھی حرکت و ارتقا کی سمتوں کو متعین کرنے کے لیے ربوبیت الٰہی کی

---

[۱۲] فصلت: ۱۲

ہر آن محتاج ہے

حیوانات اور پرندوں میں ایک حیرت انگیز ملکہ پایا جاتا ہے جسے ہم نفسیات کی اصطلاح میں جبلت کہتے ہیں۔ یہ اس کے بل پر ایسے عجیب و غریب کام سرانجام دیتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ جبلت کیا ہے جس میں شعور و ادراک نہ ہونے کے باوجود ایسے کرشمے دکھانے کی صلاحیت ہے کہ خود عقل و دانش ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہو جاتے جبلت میں شعور نہیں ہے لیکن بعض مظاہر میں شعور و ادراک کی حیرت انگیز جلوہ فرمائیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس تضاد (CONTRADICTION) کا کوئی تسلی بخش حل ارتقا اور نفسیات کے حامیوں کے پاس پایا نہیں جاتا۔

قرآن حکیم ہدایت و تربیت کے اس خاص اسلوب کو جن سے حیوانات بہرہ مند ہیں ایک طرح کی وحی قرار دے کر اس اشکال کا صحیح جواب مہیا کر دیتا ہے:

واوحی ربّك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً ومن الشجرة ومما یعرشون ۰ ثم کلی من کلّ الثمرات فاسلکی سبل ربك ذللا ۰ [۱۳]

اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں میں اس عادت کی وحی کے ذریعہ پرورش کی اور رکھا کہ پہاڑوں اور درختوں میں، اور اونچی اونچی چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں، اپنا گھر بنا اور ہر قسم کے میوے کھا اور اپنے رب کے مقرر کردہ راہوں پر بے خطر چلی جا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس عظیم وحی کی حقیقت کا انکشاف کیا کہ جس طرح حیوانات کی جبلت میں غیر عقلی اور غیر شعوری طور سے عقل و شعور کی جھلک بہر حال نمایاں ہے۔ اسی طرح نبوّت و وحی کی تہ میں بھی خرد و دانش کے تقاضے مستور ہوتے ہیں۔ یعنی وحی اگرچہ انسانی تجربہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایسا ظہور ہے جو استدلال و مشاہدہ کے نتائج سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ تاہم اس کا تعلق علیم و خبیر خدا سے ہے۔ اس لیے اس میں علم و آگاہی کی معرفت و ادراک کی معجزہ طرازیوں کا ہونا ضروری ہے۔

---

[۱۳] النحل: ۶۹

مترادفات کی کثرت عیب نہیں ہنر ہے۔ اس کے اسباب و فوائد :

عربی زبان کی من جملہ دوسری خوبیوں کے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مترادفات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ مترادفات کی یہ کثرت عربی میں کیوں کر ابھری، اس کے کئی اسباب ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ عربی چوں کہ شعر و خطابت کی زبان ہے اور شعر و خطابت کی مجبوریاں سجع اور قوافی کی کثرت چاہتے ہیں۔ اس لیے اس میں متعدد ہم معنی الفاظ کا پایا جانا کسی طرح بھی موجب حیرت نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عرب چوں کہ کسی بھی تہذیبی وحدت کی حیثیت سے جم کر نہیں رہے۔ بلکہ ہوا یہ کہ مختلف قبائل نے جہاں پانی اور سبزہ کی ارزانی دیکھی وہیں کے ہو رہے۔ اس وجہ سے ہر ہر قبیلہ نے اپنے اپنے دائرہ میں کچھ نئے الفاظ وضع کر لیے۔ اور پھر زبان میں قریش کی وجہ سے سلجھاؤ پیدا ہوا تو یہ تمام الفاظ خود بخود لسان مبین کا جزو ترکیبی بن گئے۔

مستشرقین عربی زبان کی تاریخ اور مزاج سے ناواقف ہونے کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ سکے کہ کسی زبان میں مترادفات کی کثرت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کس قدر جامع ہے اور اس کے دامن میں تنوع اور وسعت کی کس درجہ رنگا رنگی ہے۔ یہی وجہ ہے ان میں کے بعض حضرات نے کھلے بندوں عربی میں مترادفات کی کثرت کو خوبی کے بجائے نقص گردانا۔

مترادفات کے بارہ میں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ الفاظ کلیتہً ہم معنی یا مترادف نہیں ہیں، بلکہ ان سب میں معنی اور اہنگ کا ایک لطیف فرق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، ہمارے ہاں اہل لغت نے ان "فروق" پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور مستقل تصانیف کے ذریعے بتایا ہے کہ ان کے محل استعمال میں اسلوب و ذوق کی کیا کیا نزاکت پنہاں ہے۔

قرآن حکیم میں ان کے استعمال کی دو صورتیں

قرآن حکیم نے مترادف الفاظ کے استعمال میں دو اہم نکات کی نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ جہاں بھی کوئی مترادف لفظ استعمال کیا جائے صوتی اعتبار سے وہاں حد درجہ موزونیت لیے ہوئے ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں کوئی معنوی مناسبت بھی پائی جائے۔

اس سلسلہ میں دو مثالیں ملاحظہ ہوں، ان سے معلوم ہو گا کہ قرآن حکیم نے نہ صرف مترادفات کے

لیے ایک اور وجہِ جواز پیش کی ہے بلکہ ذوق و وجدان کے لیے ایک نئے سرمایہ لذت و امتزاز کا اہتمام بھی کیا ہے۔

سورہ المدثر میں ہے:

کانھم حُمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ[۵]

"(یہ منکرین) گویا گدھے ہیں کہ حق کو دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور شیر کو دیکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں"

سر دست اس تشبیہ کی باریکیوں پر غور نہ کیجیے۔ اس پر بھی نظر نہ ڈالیے کہ قرآن حکیم نے منکرین کو گدھا اور حق کو شیر قرار دے کر کس خوب صورتی سے ان کی نفسیاتی بزدلی کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے موضوع کی مناسبت سے اس میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ عربی میں شیر کے لیے متعدد الفاظ مستعمل ہیں جیسے اسد۔ لیث۔ وغیرہ

لیکن قرآن نے یہاں "قسورہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں اعجاز کا پہلو یہ ہے کہ اس آیت کی لفظی کا یہی تقاضا تھا جو "صحفا منشرہ" اور "لا یخافون الاخرۃ" کی صورت میں بعد کی آیات میں جلوہ طراز ہے۔ یعنی وہی لفظ استعمال ہونا چاہیے تھا، جس کا اظہار بعد کی آیات میں ہوا ہے۔

سورہ الانعام کی اس آیت پر غور کیجیے:

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار[۶]

نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر پاتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر پاتا ہے۔ یہاں "عین" کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں تقریباً ۲۲ مقامات پر اس کا استعمال الابصار کے معنوں میں ہوا ہے۔

لیکن اس طرح قرآن حکیم جن لطیف نکات کی نشان دہی کرتا جاتا ہے یہ نہ کر پاتا۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کے بارہ میں صرف یہی نہیں کہتا کہ جسمانی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر پاتیں۔ بلکہ اس حقیقت کا بھی انکشاف کرنا چاہتا ہے کہ جہاں تک عقل و خرد کا تعلق ہے۔ کہ رویتِ حق اور بات ہے اور ادراک حق اور۔ یہاں نفی ادراک کی ہے رویت و دیدار

---

۵ المدثر: ۵۱ ۶ الانعام: ۱۰۳)

کی نہیں، کیونکہ یہ تو سعادت ہے، اور وہ سعادت ہے جس سے عشاق حق کو بہرہ مند ہونا ہے۔

دوسری بات جس کا تعلق "وھو یدرک الابصار" سے ہے۔ بہت لطیف اور گراں مایہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب عقل و خرد کی واماندگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی براقی اور ہمہ گیری کے باوجود اس کے جمالِ جہاں آرا کے ادراک سے قاصر ہے۔ تو پھر اس کو جاننے اور پانے کی آخر متبادل صورت کیا ہے۔

بات یہ ہے کہ اب تک اثباتِ باری کے سلسلہ میں فلسفہ و فکر نے جن دلائل سے تعرض کیا۔ اس کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا تعلق تو سعی و تحقیق کے اس اسلوب سے ہے جس کا نقطۂ آغاز یہ عالمِ فانی و مادی ہے۔ اس میں جو نظم و ترتیب اور معنی و غرض یا فائدہ و استفادہ کی کارفرمائیاں پائی جاتی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والی ذات علم و حکمت اور قدرت و کمال کی صفات سے اتصاف پذیر ہے۔ تحقیق و جستجو کے اس نہج کو ہم ایسے سفر سے تعبیر کر سکتے ہیں جو فطرت سے شروع ہو کر فاطر تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے نہج اور اسلوب کا تعلق ایسے سفر سے ہے جو انسانی ذہن (HUMAN - MIND) سے شروع ہوتا ہے اور اس ذہن کا پتا دیتا ہے جو ہمہ گیر، عظیم اور خلاق ہے یعنی اس کائنات پر سرسری نظر ڈال لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نہ بخت و اتفاق کی ارزانیوں کا نتیجہ ہے اور نہ مادہ میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کو حکیمانہ انداز سے ترتیب دے سکے۔ کائنات کی اس باریک اور حکیمانہ ترتیب میں عقل و خرد کی جلوہ طرازیاں نمایاں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات مادی کے پیچھے ایک خلاق اور علیم و حکیم ذہن کارفرما ہے۔ (جاری)